

# میرے دادا دادی۔ جنگ، ضمیر اور ورثے کا ایک خاندانی یادگار

میں اپنے خاندان کا آخری فرد ہوں۔

اب کوئی زندہ نہیں جو میرے دادا دادی کو محض تصاویر یا ریکارڈ میں ناموں کی بجائے انسانوں کی طرح یاد رکھتا ہو۔ جب میں مر جاؤں گا تو یہ یاد ختم ہو جائے گی کہ وہ کون تھے، ان کی خاموش جرات کیا تھی، اور وہ کتنا غم اٹھائے پھرتے تھے، جب تک کہ میں اسے لکھ نہ لوں۔ یہ ایک ذاتی کہانی ہے، لیکن صرف ذاتی نہیں۔ یہ بیسویں صدی کی بربریت کو چھوتی ہے، اس بات کو کہ ایک آمریت کے نیچے ضمیر کو زندہ رکھتے ہوئے جیون گزارنا کیا تھا، اور اس نازک لکیر کو جو عام لوگوں کو مجرم اور مزاحمت کار کے درمیان کھڑی کر دیتی تھی۔

یہ کہانی میرے دادا دادی کی ہے: میری دادی جو ویانا پر بمباریوں میں بچیں اور اپنے بچوں کا ناقابلِ برداشت نقصان اٹھایا، اور میرے دادا، ایک ماہر دھات کار جو جنگ کے ایک فیکٹری کے اندر سے نازی رجیم کے خلاف چھوٹے چھوٹے خطرناک طریقوں سے مزاحمت کرتے رہے۔ میں یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ان کی کہانی زندہ رہنے کے لائق ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ان کی زندگیاں آج مجھے انصاف، یاد اور اخلاقی وضاحت کے بارے میں سمجھاتی ہیں۔

## نانی: بموں کے نیچے بقا

میری نانی 1921 میں پیدا ہوئیں اور دوسری عالمی جنگ ویانا کے مشرقی اضلاع میں گزاری۔ عام شہریوں کی طرح وہ حکام کے احکامات کی پابندی کرتی تھیں۔ جو نہی ہوئی حملے کا سائرن بجتا، وہ بچوں کو لے کر عمارت کے مقرر کردہ ایئر ریڈ شیلٹر یعنی زیر زمین تہ خانے میں دوڑ جاتیں۔

یہ شیلٹر اکثر بس عام تہ خانے ہی ہوتے تھے۔ نم، بھیڑ بھرے، ہوا کا گزر کم۔ انہیں Luftschutzkeller کہتے تھے، مگر تحفظ کا نام نہ تھا۔ ہوا بھاری اور سڑی ہوئی، بیتیاں غیر یقینی، اور بلیک آؤٹ کے قواعد کی وجہ سے ایک چھوٹی سی روشنی کی کرن بھی

شک پیدا کر سکتی تھی۔ حملوں کے دوران وہ تہہ خانے لوگوں، خوف کی بھاری خاموشی اور چھت کے گرنے یا ٹھہرنے کے انتظار سے بھرے ہوتے تھے۔

ایک رات وہ تہہ خانہ نہ ٹھہرا۔

جس شیلٹر میں نانی تھیں، اس پر براہ راست یا تقریباً براہ راست بم گرا۔ اوپر والی عمارت گر گئی۔ دھماکہ، بلبہ، جنگ کا زور۔ سب ان کے پناہ گاہ میں گھس آیا۔ نانی کو ملبے سے زندہ نکال لیا گیا مگر شدید زخمی۔ ان کی کھوپڑی کا ایک حصہ ٹوٹ گیا تھا اور ہٹانا پڑا۔ سرجنوں نے اس کی جگہ دھاتی پلیٹ لگا دی۔ باقی زندگی آپ ان کی کھوپڑی کے نیچے اس پلیٹ کا کنارہ چھو کر محسوس کر سکتے تھے۔ وہ کہتی تھیں سردی یا طوفان سے پہلے درد بڑھ جاتا ہے۔ ایک مدہم سی تکلیف، جنگ کی یاد دلاتی ہوئی۔

لیکن سب سے بڑا زخم جسمانی نہ تھا۔

ان کے پہلے دو بچے اسی رات چلے گئے۔ اینٹوں اور آگ کے ایک پل میں سب ختم۔ اس نسل کی عورتوں کی طرح انہیں بھی آگے بڑھنا پڑا۔ دفنانا، غم کرنا، زندہ رہنا، بغیر ٹوٹنے کی جگہ کے۔ وہ غم انہوں نے جنگ کے بعد کے بھوکے اور افراط فری بھرے ویانا میں اٹھایا۔

اور پھر بھی انہوں نے دوبارہ آغاز کیا۔

1950 میں انہوں نے میری ماں کو جنم دیا۔ صحت مند، زندہ، ایک بچہ جو تباہ شدہ شہر کے ملبے میں پیدا ہوا جو خود کو دوبارہ بنا رہا تھا۔ اس جرات کی عظمت بیان نہیں کی جا سکتی۔ جسم ٹوٹا ہوا مگر کام کرنے والا۔ دل اب بھی امید رکھنے والا۔

مگر وہ کبھی اس سے آزاد نہ ہو سکیں۔ زندگی بھر انہوں نے کبھی سب وے نہ لی۔ زیر زمین، بند جگہ میں ہونے کا خیال ہی ناقابل برداشت تھا۔ اور پھر بھی اپارٹمنٹ کے تہہ خانے کے سٹوریج لاکر کو استعمال کرنے پر مجبور کرتی رہیں۔ ایک چھوٹا سا بغاوت بھرا عمل: اس جگہ کی طرف واپس جانا جو قریب قریب انہیں مار چکا تھا، نہ کہ وہ چاہتی تھیں، بلکہ زندگی نے مجبور کیا۔

وہ درد، یاد اور خاموشی کے ساتھ جینیں۔ مگر جینیں۔

دادا: لیتھ کا کام، ضمیر اور پیتل

میرے دادا 1912 میں پیدا ہوئے اور ایک بالکل مختلف ویانا میں جوان ہوئے۔ جنگوں کے درمیانی دور میں سیمی پروفیشنل فٹ بال کھیلنے اور دھات کے ساتھ کام کرتے۔ وہ Dreher بن گئے۔ یعنی لیتھ مشین آپریٹر، وہ شخص جو دھات کو درست طریقے سے گھڑتا اور کاٹتا ہے۔ یہ ہنر انجانے میں ان کی جان بچانے والا بنا۔

1938 میں جب آسٹریا کو نازی جرمنی میں ضم کیا گیا تو مطابقت ہی بقا بن گئی۔ نازی پارٹی کی رکنیت پہلے حوصلہ افزائی، پھر توقع، پھر مجبوری بن گئی۔ دادا کبھی شامل نہ ہوئے۔ اس کی قیمت محدود موقع، سخت نگرانی اور غداری کا الزام لگنے کے خطرے کی صورت میں ادا کی۔ مگر وہ ڈٹ گئے۔

جنگ آئی تو بھرتی بھی۔ ان کی عمر کے زیادہ تر مرد فرنٹ پر بھیجے گئے۔ دادا ویہراخت سے اپنے ہاتھوں کی وجہ سے بچ گئے۔ ان کا ہنر جنگی صنعتوں میں درکار تھا، سو وہ ہتھیاروں کی پیداوار میں لگ گئے۔ وہ جنگ کی مشین کا حصہ بنے، فوجی نہیں بلکہ دھات کار کے طور پر۔

وہ Simmering کے مشرقی ضلع میں واقع بڑی صنعتی کمپنی Saurer Werke میں کام کرتے تھے۔ جنگ کے دوران ساورر فوجی پیداوار میں گہرا شامل ہو گیا: ٹرکوں کے انجن، بھاری گاڑیاں، اور نازی جنگی مشین کو چلانے والے پرزے۔ فیکٹری بہت بڑی اور رجیم کی ضروریات میں مکمل ضم تھی۔ وہاں بڑے سیمانے پر جبری مزدور استعمال ہوتے تھے۔ مقبوضہ ممالک کے کارکن، قیدی اور دوسرے جو وحشیانہ حالات میں کام پر مجبور تھے۔

دادا نے اپنے پاس موجود تھوڑی سی گنجائش کو مزاحمت کے لیے استعمال کیا۔

فیکٹری کے کچن سے وہ بچا کھچا کھانا۔ جو پھینکنے یا عام کارکنوں کے لیے ہوتا۔ جبری مزدوروں کو پہنچاتے۔ ایک سخت روٹی کا ٹکڑا، چند آلو۔ بہت کم لگتا ہے۔ مگر کم نہ تھا۔ جس رجیم میں رحم جرم تھا اور ساتھی کارکن بھی مخبر ہو سکتے تھے، وہاں چھوٹے سے چھوٹے مہربانی کے عمل بھی خطرناک تھے۔ پکڑے جاتے تو نوکری سے ہاتھ دھونا یا اس سے بھی بڑی سزا ہو سکتی تھی۔ انہوں نے وہ خطرہ اٹھایا۔

اور ایک اور تفصیل جو مجھے ابھی حال ہی میں واضح ہوئی۔ دادا پیتل (براس) کے ساتھ کام کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کیونکہ وہ لھر پیتل کے گلدان بنا کر لاتے تھے۔ اور کیونکہ نانی کو شادی کے تحفے میں انہوں نے ایک چھوٹی سی فن پارہ بنایا: تین کھجوروں والی پ Exerc کی ایک کشتی، جو ورق اور تار سے نہایت نفیس طریقے سے گھڑی گئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور فیکٹری والے ہی مواد سے بنی تھی۔

یہ ایک حیران کن امکان کی طرف لے جاتا ہے۔

نازی رجیم کو تمغوں، اعزازات اور علامتی اشیاء کا جنون تھا۔ نشانات، بیجز، سواستیکا پن، آئرن کراس۔ یہ سب کثیر تعداد میں بنائے جاتے تھے تاکہ اطاعت کو انعام دیا جائے، تشدد کی تعریف کی جائے اور درجہ بندی قائم رکھی جائے۔ ان میں سے بہت سے پیتل یا اس جیسے الائے سے بنتے تھے۔ اگر دادا فیکٹری کے اس شعبے میں تھے جو نفیس دھاتی کام کرتا تھا (جو ممکن معلوم ہوتا ہے)، تو شاید وہ خود رجیم کے انہی تمغوں کی تیاری میں شریک رہے ہوں۔

اگر ایسا ہے تو یہ تلخ ستم ظریفی ہے۔ ایک شخص جو پارٹی میں کبھی شامل نہ ہوا، جبری مزدوروں کو کھانا پہنچاتا رہا، ریاستی نظریے کو مسترد کرتا رہا۔ وہ اپنے ہنر سے رجیم کے تمغے بنا رہا ہو۔ وہی ہنر جس نے ان کے ہاتھوں محبت کرنے والی عورت کو شادی کا تحفہ دیا۔ ایک کشتی۔ کھجوریں۔ امن۔

## رسموں والی آمریت میں مزاحمت

لھر میں بھی دباؤ مسلسل تھا۔

جب دادا دادی کی شادی ہوئی تو رجیم نے انہیں ”تحفہ“ دیا: مفت Mein Kampf کی ایک کاپی۔ اس وقت یہ معمول تھا۔ ایک علامتی اشارہ کہ ہر شادی اور ہر خاندان کو ہٹلر کے نظریے سے جوڑ دیا جائے۔ نانی نے سرخ پنسل لی اور کتاب کے جلد پر سواستیکا کو کاٹ کر مٹا دیا۔ کتاب پھینکی نہیں۔ رکھی۔ نہ عزت کی وجہ سے بلکہ گواہی کی حیثیت سے۔ زبردستی گھس بیٹھنے کا ایک نشان۔ جو ان پر مسلط کیا گیا تھا اس کی یاد۔

ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ہٹلر کے ریڈیو خطاب سنیں۔ نازیوں نے سستے ریڈیو سیٹ بڑے پیمانے پر بنائے۔ Volksempfänger یعنی ”عوامی ریسیور“ تاکہ پروپیگنڈا سے آبادی بھر دی جائے۔ مقامی افسر جنہیں Blockwarte کہتے تھے، نگرانی کرتے تھے۔ اگر آپ کا ریڈیو بند ہو، اگر آپ نہ سن رہے ہوں، اگر بلیک آؤٹ پردے سے روشنی کی ایک کرن بھی باہر نکلے تو رپورٹ ہو سکتی تھی۔

دادا دادی نے راستے نکالے۔

وہ Blockwart کو چھوٹے چھوٹے احسانات سے ”خوش“ رکھتے۔ کہتے کہ ریڈیو خراب ہو گیا یا سگنل غائب ہے۔ کبھی خاموشی سے بیٹھے رہتے اور گھر خالی ہونے کا دکھاوا کرتے۔ کبھی جب معلوم ہوتا کہ نگرانی ہو رہی ہے تو خطاب پوری آواز میں

چلا دیتے تاکہ پوری عمارت سن لے۔ یہ وفاداری کا ڈرامہ نہ تھا، بقا کا ڈرامہ تھا۔

ان کی مزاحمت خاموش تھی۔ حکمت عملی سے بھرپور۔ کھل کر مخالفت نہیں کی جاتی تھی۔ وہ خودکشی ہوتی۔ مگر اپنے اپنے انداز میں انہوں نے انکار کیا۔

## میرے لیے اس کا مطلب

میں احساسِ جرم کی وراثت میں پروان نہیں چڑھا۔ میرے دادا دادی SS کے رکن نہ تھے۔ نظریاتی نہ تھے۔ مجرم نہ تھے۔ وہ عام لوگ تھے غیر معمولی دباؤ میں، اور انہوں نے خاموش جرات سے انسانیت کو بچانے رکھنے کی کوشش کی۔

یہ آج میرے لیے اہم ہے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ماضی کو حال کو ڈھالنے کے لیے کیسے استعمال کیا جا رہا ہے۔

یورپ کے کچھ حصوں، خاص طور پر جرمنی اور آسٹریا میں تاریخی بوجھ نے کچھ سیاسی رہنماؤں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسرائیل کو بلا شرط حمایت دیں، چاہے وہ فلسطینیوں کے خلاف کتنے ہی سنگین مظالم کرے۔ منطق (خواہ غیر علانیہ ہو) واضح ہے: کیونکہ ہم اس وقت مجرم تھے، اس لیے آج تنقید نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہودی ہماری بربریت کے شکار تھے، اس لیے یہودی ریاست کی ہر بات پر آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔

مگر یہ منطق غلط ہے۔ دو غلطیاں مل کر صحیح نہیں ہو جاتیں۔

ہولوکاسٹ میں یہودیوں کا درد آج فلسطینیوں کے درد کو جائز نہیں ٹھہراتا۔ یورپی ریاستوں کا قصور کسی دوسرے بے گھر کیے گئے قوم سے وصول نہیں کیا جانا چاہیے۔ ماضی کے جرائم کو موجودہ جرائم پر پردہ ڈال کر معاف نہیں کیا جاسکتا۔

میرے دادا دادی نے وہ جرائم نہیں کیے۔ وہ آمریت میں رہے مگر شائستگی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ دادا نے پیتل کو رحم کے نشان بنایا جبکہ فیکٹری ان سے طاقت کے نشان بنوا رہی تھی۔ نانی نے سرخ پنسل سے سواستیکا مٹایا۔ ان کی مثال مجھے طاقت دیتی ہے کہ صاف بات کروں۔

مجھے ان گناہوں کا کفارہ دینے کی کوئی مجبوری نہیں جن کا ارتکاب میری فیملی نے نہیں کیا۔ مجھے ان اقدار کی عزت افزائی کی مجبوری ہے جن پر وہ جسے رحم مطابقت پر، شائستگی عقیدے پر، اور اس جرات کے ساتھ پرواہ کرنا خطرناک تھا۔

یاد یعنی انکار

یہ میرا ریکارڈ ہے۔ میرا نذرانہ ہے۔ ان کی کہانی کے غائب ہو جانے سے میرا انکار ہے۔

یہ پیتل اور بموں کی کہانی ہے۔ ضرورت سے زیادہ بلند ریڈیو اور چھپ کر بانٹے گئے کھانے کی۔ ایک کھوپڑی کی جو زندگی بھر درد اٹھاتی رہی، اور پیتل کی ایک کشتی کی جو یادوں میں تیرتی رہی۔ ان لوگوں کی جو کبھی ہیرو ہونے کا دعویٰ نہ کرتے، مگر عفریت بننے سے انکار کرتے رہے۔

میں یہ لکھتا ہوں تاکہ وہ بھولائے نہ جائیں۔ اور یہ لکھتا ہوں تاکہ خود کو اور ہر پڑھنے والے کو یاد دلاؤں کہ انصاف عالمگیر ہونا چاہیے۔ یاد ایماندار ہونی چاہیے۔ رحم کبھی مشروط نہیں ہونا چاہیے۔

اندھیرے میں بھی ایک چھوٹا سا مہربانی کا عمل روشنی بن سکتا ہے۔ یہی میرے دادا دادی نے مجھے سکھایا۔

اور یہی وجہ ہے کہ میں یاد رکھتا ہوں۔